ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

CC BY NC

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی
ایسوسی ایٹ پروفیسر ہزارہ یونیورسٹی
حفصہ الطاف
ریسرچ سکالر ہزارہ یونیورسٹی
ڈاکٹر رابعہ شاہ
لیکچرر ہزارہ یونیورسٹی

مختار مسعود کی تصنیف "آوازِ دوست" میں فلیش بیک تکنیک کا استعمال

Dr.Altaf Yousafzai*
Associate Professor, Hazara University.
Hafsa Altaf
Research Scholar, Hazara University.
Dr.Rabia Shah
Lecturer, Hazara University.

***Corresponding Author:**

"The Use of the Flashback Technique in Mukhtar Masood's Awaz-e-Dost: An Artistic and Stylistic Study"

The flashback technique in Mukhtar Masood's celebrated prose work Awaz-e-Dost, with particular emphasis on its artistic, stylistic, and intellectual dimensions. The research explores how the author employs flashback as a narrative strategy to establish a meaningful relationship between the past and the present, thereby enriching historical consciousness, cultural identity, and national thought. Through a close textual analysis of selected essays, including Minar-e-Pakistan, Aligarh ka Sang-e-Bunyad, Koh-e-Noor, Marshal Tito, and Tokyo Bazaar, the study demonstrates that flashback in Awaz-e-Dost extends beyond a conventional narrative device and functions as a medium for historical interpretation and civilizational reflection. Mukhtar Masood integrates personal memories, historical events,

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44
ماخذ تحقیقی مجلہ

religious symbols, and cultural references to produce a coherent literary discourse that enhances both the aesthetic appeal and intellectual depth of his prose. The study further highlights that the author's distinctive style transforms historical narratives into living experiences, enabling readers to interpret contemporary realities through the lens of the past. It concludes that the flashback technique constitutes one of the defining characteristics of Mukhtar Masood's prose style and significantly contributes to the literary, historical, and ideological richness of Awaz-e-Dost, securing its position as a landmark work in modern Urdu prose.

Key Words: *Mukhtar Masood, Awaz-e-Dost, Flashback Technique, Urdu Prose, Narrative Technique, Stylistic Analysis, Historical Consciousness, Cultural Identity.*

فلیش بیک بیانیہ ادب کی ایک اہم فنی تکنیک ہے، جس کے ذریعے مصنف حال سے ماضی کی طرف رجوع کرتا ہے تاکہ کسی کردار، کہانی، واقعے یا صورتِ حال کی وضاحت کی جا سکے۔ اس تکنیک کی مدد سے کہانی، ڈراما، افسانہ یا ناول میں ماضی کے واقعات کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ حال کے واقعات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اردو ادب میں فلیش بیک کا استعمال خصوصاً ناول، افسانے اور ڈرامے میں بڑی مہارت سے کیا گیا ہے۔

فلیش بیک کا بنیادی مقصد کرداروں کی نفسیاتی کیفیت، ان کے ماضی کے تجربات، ان کے جذبات اور موجودہ حالات کی وجوہات کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ اس سے قاری کو کردار کی شخصیت اور اس کے عمل کو بہتر انداز میں سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ فلیش بیک کے ذریعے کرداروں کی شخصیت میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور اس سے ماضی اور حال کے درمیان ایک مضبوط ربط پیدا ہوتا ہے۔ مصنف کہانی میں فلیش بیک کی تکنیک کو ایسے مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے کے قاری کی کہانی میں دلچسپی بڑھتی ہے اور ڈرامے، ناول، افسانے اور کہانی کے واقعات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ مصنف یک دم کہانی میں فلیش بیک کے ذریعے قاری کو ایک نئے رخ سے متعارف کرواتا ہے جس سے کہانی میں لطف، تجسس، اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور موجودہ صورت حال کو بڑی تیزی سے ماضی سے جوڑا جاتا ہے۔

فلیش بیک کے طریقہ کار کو استعمال کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر آصف اقبال یوں لکھتے ہیں۔:

> "فلیش بیک تکنیک میں مصنف کرداروں کے ہمراہ ماضی میں سفر کرتا ہے یا وہ تبصروں کے ذریعے کرداروں کے ذہنی وقوعات سامنے رکھتا ہے جس میں خود کلامی کو نمایاں حیثیت

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

حاصل ہوتی ہے۔چوں کہ ماضی ہمارے شعور کا حصہ ہوتا ہے اس لیے اس میں انسانی تجربوں کی رنگارنگی ماضی کے پس منظر میں یاد کی جاتی ہے"۔[۱]

جدید دور میں اردو ادب کی بات کی جائے تو افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں، جیسے **انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ، شمس الرحمٰن فاروقی، ممتاز مفتی** اور دیگر ادیبوں نے فلیش بیک کی تکنیک کو نہایت فنی انداز میں اپنی تحریروں میں برتا ہے۔ان کی تخلیقات میں حال کے ساتھ ماضی کی یادیں اس انداز سے مربوط ہوتی ہیں کہ کہانی کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیاں واضح ہوتی ہیں۔فلیش بیک یا تخیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ زمانوں کے تفرق کو ختم کر کے انسان کو ماضی اور حال کی پابندیوں سے آزاد کراتا ہے۔۔یہی وجہ ہے کہ ادیب و شاعر فلیش بیک تکنیک کے ذریعے ماضی میں ہونے والے واقعات و مشاہدات کے ساتھ ربط قائم کرنے میں نظر آتے ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر ہارون الرشید لکھتے ہیں:

> "تخیل کا میدانِ عمل بہت وسیع ہے،اس کی مدد سے ماضی اور مستقبل کو حال میں سمیٹا جاتا ہے۔ادیب گو کہ خود کو زمانہ حال میں سمجھتا ہے لیکن اپنے تخیل کے ذریعے وہ ماضی کا تعلق موجودہ صورت حال سے اتنے عمدہ انداز میں جوڑتا ہے کہ قاری کے لطف میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور کسی اہم تاریخی واقعہ کے متعلق معلومات بھی مل جاتی ہیں۔"نظر نامہ" کے مصنف یوں تو مصر میں موجود مجسمے دکھاتے ہیں لیکن ان کا تخیل انھیں فراعین کے دور میں پہنچا دیتا ہے۔جدھر غرور و تکبر سے بھرپور حکمران مخلوق خود کے سامنے خود کو خدا گردانتے رہے۔ تخیل کے ذریعے ہی تصورات کو حقیقت میں بدلا جاسکتا ہے۔ایسی مجرد اشیا جن کی مادی حقیقت نہیں ہے۔ان کا دیکھنا جانا ممکن نہیں ہوتا۔البتہ تخیل کی مدد سے یہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ تخیل کی مدد سے نہ صرف ان مشاہدات کی از سر نو ترتیب کی جاتی ہے بل کہ حال پر ماضی اور مستقبل کو سمیٹ کر تصورات کو شکل دی جاتی ہے"۔[۲]

اسی طرح مختار مسعود نے بھی بڑی مہارت کے ساتھ اپنی تصنیف " آواز دوست " میں فلیش بیک کی تکنیک کو برتا ہے۔اردو ادب میں چند نثر نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنے منفرد اسلوب، فکری گہرائی اور تہذیبی شعور کے باعث ہمیشہ کے لیے ادبی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ان ہی چند نثر نگاروں میں مختار مسعود کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کی نثر محض واقعات کا بیان نہیں ہوتی بلکہ تاریخ، تہذیب، مذہب، فلسفہ اور قومی شعور کا حسین امتزاج

ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44
ماخذ تحقیقی مجلہ

ہے۔ مختار مسعود کے ہاں ماضی اور حال اس طرح ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں کہ قاری صرف واقعات نہیں پڑھتا بلکہ تاریخ کو محسوس کرتا ہے اور حال میں موجود ہونے کے باوجود ماضی کی دلچسپ کہانیوں، قصوں اور واقعات سے معزوز ہوتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کی شہرۂ آفاق تصنیف **"آوازِ دوست"** کو اردو نثر کا ایک منفرد شاہکار بناتی ہے۔

مختار مسعود نے اپنی تحریروں میں جن فنی مہارتوں سے کام لیا ہے ان میں **فلیش بیک** کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کسی موجودہ منظر، شخصیت یا واقعے سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور پھر اچانک ماضی کے کسی تاریخی، مذہبی، تہذیبی یا شخصی واقعے کی طرف موڑ جاتے ہیں اور اپنی تخلیقی مہارت سے حال اور ماضی کے درمیان ایسا ربط و تسلسل قائم کرتے ہیں کہ قاری ماضی اور حال کو ایک ہی فکری سلسلے کی کڑیاں محسوس کرتا ہے۔ اسی اسلوبی مہارت اور فنی خصوصیات نے مختار مسعود کی نثر کو ادبی حسن، فکری گہرائی اور تاریخی وسعت عطا کی ہے۔

" مختار مسعود کی پہلی تصنیف **"آواز دوست"** ہے، جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے، جو اس کتاب کی مقبولیت اور ادبی عظمت کا ثبوت ہیں۔ یہ کتاب مضامین کا مجموعہ ہونے کے باوجود ایک مربوط فکری وحدت رکھتی ہے، کیونکہ اس کتاب میں موجود ہر مضمون تاریخ، تہذیب، مذہب، قومی شعور اور انسانی اقدار کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اگر اس کتاب کے انتساب پہ غور کیا جائے تو وہ بھی مختار مسعود کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اسے اپنے والدین کے نام منسوب کر کے یہ واضح کیا کہ انسان کی پہلی درسگاہ اس کا گھر اور والدین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں محبت، وفاداری، تہذیب اور روایت کا رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

مختار مسعود کی نثر کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ حال کے کسی معمولی منظر کو تاریخ کے وسیع تناظر سے اس طرح جوڑ دیتے ہیں کہ دونوں زمانے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ **آوازِ دوست** میں شامل مضمون **مینارِ پاکستان** اس اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔ بظاہر یہ مضمون ایک یادگار عمارت کی تعمیر کی داستان ہے، لیکن حقیقت میں یہ برصغیر کے مسلمانوں کی فکری، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ آواز دوست "میں موجود مضمون **"مینار پاکستان "**میں مصنف ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے مینارِ پاکستان کی تعمیر سے وابستہ تھے، مگر انہوں نے اس ذمہ داری کو محض انتظامی یا سرکاری فریضہ نہیں سمجھا بلکہ اسے تحریکِ پاکستان کے خواب کی تعبیر قرار دیا۔ یہی احساس انہیں بار بار ماضی کی طرف لے جاتا ہے، جہاں سے وہ حال کو معنی اور جہت عطا کرتے ہیں۔

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

ماخذ تحقیقی مجلہ

مضمون کا آغاز اگرچہ مینارِ پاکستان کی تعمیر سے ہوتا ہے، لیکن جلد ہی مصنف قاری کو اس زمانے میں لے جاتا ہے جب اس یادگار کو "**یادگارِ پاکستان** " کہا جاتا تھا۔ لفظ "**یادگار** " پر ہونے والی بحث محض لغوی اختلاف نہیں بلکہ قومی نفسیات کی ترجمان ہے۔ مختار مسعود اس موقع پر ماضی کے تصورات، لغات اور تہذیبی معانی کو یاد کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ الفاظ بھی قوموں کی تاریخ اور نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ "یادگار" کی جگہ "مینار" کا انتخاب مستقبل، استقامت اور رہنمائی کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں **فلیش بیک** کسی واقعے کی وضاحت نہیں بلکہ ایک قومی فکر کی تشکیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس حوالے سے مختار مسعود لکھتے ہیں۔:

> "چوکیدار سے میں نے استفسار کیا کہ یہ کیا تعمیر ہو رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یادگار۔ آج جب کاروائی کے سلسلہ میں اولین دشوار معاملہ پیش آیا تو میں نے ملتوی کرنے کا کہہ دیا تا کہ ایک ضروری معاملے پر مباحثہ ہو سکے۔ میز پر لغات کے ڈھیر لگ گئے۔ سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ یادگار وہ خیر کی نشانی ہے جو مرنے کے بعد باقی رہے۔ بحث و مباحثہ کے بعد جب یادگار کا عام تصور موت و فنا کے تصور سے الگ نہ ہوا تو منصوبے سے یادگار کا لفظ نکال دیا گیا۔ میز صاف کر کے اس پر پڑی لغات کی جگہ قرارداد پاکستان کے مینار نقشے پر پھیلا دیے گئے"۔ (۳)

اس کے بعد مصنف تعمیراتی مجلس کی نشست کا ذکر کرتے ہوئے اچانک **برنارڈ شا** کے مشہور قول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک معمولی یاد ہے، لیکن حقیقت میں یہ **فلیش بیک** مصنف کی ذہنی دنیا کو آشکار کرتا ہے۔ وہ اپنے حالیہ منصب کو محض سرکاری ذمہ داری نہیں سمجھتے بلکہ اسے اپنے فکری اور قومی نصب العین سے وابستہ کرتے ہیں۔ یہی انداز مختار مسعود کے ہاں **فلیش بیک** کو داخلی خود کلامی اور فکری مکالمے کی صورت عطا کرتا ہے۔ اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مینارِ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے مصنف صرف لاہور تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری انسانی تہذیب کے میناروں کا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ وہ مصر کے اہرام، دمشق کی مسجدِ بنو امیہ، ایفل ٹاور، پیسا، بولونیا، سمرقند، بخارا، اندلس اور برصغیر کے تاریخی میناروں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ تمام مقامات بظاہر الگ الگ تاریخی ادوار سے تعلق رکھتے ہیں، مگر مختار مسعود انہیں ایک فکری زنجیر میں پرو دیتے ہیں۔ یوں قاری محسوس کرتا ہے کہ مینارِ پاکستان بھی اسی تہذیبی روایت کی ایک نئی کڑی ہے۔ اس طرح میناروں کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

ماخذ تحقیقی مجلہ

"مسجد بنو امیہ کا شمال کی طرف کا یہ مینار تقریباً تیرہ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بلاشبہ ہمارے میناروں کے لیے امامت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی پشت پر ان گنت مینار ہیں۔ اب ایک نیا مقتدی بھی آخری صف میں آن شامل ہوا ہے جسے مینار قرارداد پاکستان کہتے ہیں"۔[۴]

یہاں فلیش بیک کی ایک اہم خصوصیت سامنے آتی ہے کہ مصنف تاریخی معلومات کو خشک انداز میں پیش نہیں کرتے بلکہ ذاتی مشاہدات اور یادوں کے ذریعے انہیں زندہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے بیان میں تاریخ کتابوں کا موضوع نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ تجربہ بن جاتی ہے۔ یہی اسلوب قاری کو ماضی کے ساتھ جذباتی اور فکری سطح پر جوڑ دیتا ہے۔ اسی سلسلے میں مسجدِ بنو امیہ کے مینار کا ذکر غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ مختار مسعود دمشق کے اس عظیم مینار کو اسلامی دنیا کے تمام میناروں کا پیش رو قرار دیتے ہیں۔ جب وہ مسجدِ بنو امیہ کی تعمیر، اس کے حسن اور اس کی عظمت کو یاد کرتے ہیں تو درحقیقت وہ قاری کو اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں لے جاتے ہیں۔ پھر اچانک حال میں واپس آ کر مینارِ پاکستان کو اسی تاریخی تسلسل کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ یہی فلیش بیک کا وہ فنی حسن ہے جو ماضی اور حال کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کرتا ہے۔

مختار مسعود مختلف میناروں کے تذکرے کے ذریعے صرف تعمیراتی فن کا بیان نہیں کرتے بلکہ تہذیبوں کے عروج و زوال کا فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ مینار صرف پتھر کی عمارتیں نہیں بلکہ قوموں کی فکری، مذہبی اور سیاسی شناخت کی علامت ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب وہ عالمگیر مسجد کے مینار، سکھوں کے مندروں اور برطانوی اقتدار کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے پس منظر میں برصغیر کی کئی صدیوں پر محیط تاریخ جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے مختار مسعود کچھ یوں لکھتے ہیں:۔

"برعظیم میں عالمگیر مسجد کے بعد یہ پہلا اہم مینار تکمیل کو پہنچا ہے۔ مینار تو ایک دوسرے کے مقابل ہیں مگر ان کے درمیان تھوڑے سے فاصلے پر سکھوں کے مندر اور فرنگیوں کا ٹھہراؤ تھا۔ جو صدیوں کا ماتم کر رہے تھے۔ یکایک مسجد کا مینار جھکا اور میرے کان میں راز کی بات کہہ گیا کہ جب مسجدوں میں رونق باقی نہ رہے اور مدرسوں کی روشنی بھی مدھم پڑھ جائے ،جب جہاد کی جگہ کاہلی اور حق بات کہنے سے گریز کا رویہ عام ہو جائے ،جب مسلمان موت سے خوف کھائیں اور زندگی سے محبت کرنے لگیں تو صدیاں ایسے ہی گم ہو جاتی ہیں۔"[۵]

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

مصنف کا یہ جملہ کہ **"جب مسجدوں میں رونق باقی نہ رہے اور مدرسوں کی روشنی مدھم پڑ جائے تو صدیاں گم ہو جاتی ہیں "** دراصل ایک تاریخی فلیش بیک ہے۔ اس ایک جملے میں مسلمانوں کے عروج، زوال اور ان کی تہذیبی کمزوریوں کی پوری تاریخ سمٹ آتی ہے۔ یہی مختار مسعود کے اسلوب کی انفرادیت ہے کہ وہ چند الفاظ میں صدیوں کی داستان بیان کر دیتے ہیں۔

یہ مضمون اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ مختار مسعود کے نزدیک فلیش بیک صرف ماضی کی یاد نہیں بلکہ حال کی تفہیم کا ذریعہ ہے۔ وہ ماضی میں اس لیے نہیں جاتے کہ قاری کو پرانی داستانیں سنائیں بلکہ اس لیے جاتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی معنویت واضح ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مینارِ پاکستان کی تعمیر کا ہر مرحلہ تحریکِ پاکستان، اسلامی تہذیب اور قومی شناخت کے کسی نہ کسی تاریخی واقعے سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی فنی مہارت کی بدولت "مینارِ پاکستان" ایک تعمیراتی رپورٹ نہیں رہتی بلکہ قومی تاریخ، اسلامی تہذیب اور فکری شعور کی علامت بن جاتی ہے۔ مختار مسعود نے فلیش بیک تکنیک کے ذریعے اس مضمون کو ایسی ادبی وحدت عطا کی ہے جس میں تاریخ، ادب، تہذیب اور جذبات ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

مختار مسعود کی کتاب **آواز دوست** میں موجود "علی گڑھ کا سنگ بنیاد" میں فلیش بیک تکنیک کی سب سے مؤثر مثال ہے۔ مصنف جب مینارِ پاکستان کے آغاز، تعمیراتی بنیادوں اور ان میں استعمال ہونے والے مصالحے پر گفتگو کرتے ہیں تو اچانک ان کے ذہن میں علی گڑھ کالج کے سنگِ بنیاد کی تقریب تازہ ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فلیش بیک محض ماضی کی یاد نہیں رہتا بلکہ ایک تاریخی، فکری اور تہذیبی ربط کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مختار مسعود اس منظر کو اس قدر جاندار انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس تقریب کا عینی شاہد محسوس کرنے لگتا ہے۔ مصنف آنکھیں بند کرتے ہیں تو ان کے سامنے ۶ جنوری ۱۸۷۷ء کا منظر زندہ ہو جاتا ہے۔ خصوصی ٹرین، وسیع پنڈال، مہمانوں کا ہجوم، دعائیہ تقاریر اور سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب ـــــ یہ تمام مناظر اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ حال اور ماضی کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ یہی فلیش بیک کی اصل کامیابی ہے کہ قاری وقت کی قید سے آزاد ہو کر تاریخی لمحے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں مختار مسعود لکھتے ہیں:۔

> "مجلس تعمیر کی آج پھر نشست تھی۔ میرا سوال تھا کہ اس مینار کی بنیادوں کی گہرائی کتنی ہے اور ان میں کون سا مسالا استعمال ہوا ہے۔ جواب آیا کہ بنیادیں بہت گہری ہونے کے ساتھ پائیداری کی خاطر اعلیٰ درجے کا ریختہ استعمال ہوا ہے۔۔ اسی لمحے میں نے اپنی آنکھیں بند کر

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

لیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے سنگ بنیاد کا منظر تھا۔پٹیالہ سے ایک خصوصی ٹرین چل کر صبح سویرے چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی ہو گی۔۔سنگ بنیاد کی تقریب دوپہر کو منعقد ہو رہی تھی۔وسیع پنڈال سج گیا۔مہمانوں کا بہت زیادہ رش تھا۔۔خطاب شروع ہوئے۔تمام تقاریر کے اختتام پر مہمان خصوصی شامیانے کے اُس کونے پر پہنچے جہاں بنیاد رکھنی تھی"۔(۱)

مختار مسعود کے نزدیک علی گڑھ محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی فکری بیداری، سیاسی شعور اور قومی تشخص کی علامت ہے۔اسی لیے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بظاہر تو اس دن علی گڑھ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، لیکن حقیقت میں اسی لمحے پاکستان کی فکری بنیاد بھی استوار ہو گئی تھی۔یہ ربط تاریخی حقیقت کے ساتھ ساتھ مصنف کے فکری نقطۂ نظر کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔

سرسید احمد خان کی شخصیت کا ذکر بھی اسی فلیش بیک کے ذریعے سامنے آتا ہے۔مختار مسعود سرسید کو ایک مصلح، مفکر اور قوم ساز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔وہ ریلوے اسٹیشن پر "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ برصغیر کی سیاسی تقسیم کے آثار بہت پہلے نمایاں ہو چکے تھے۔بعد ازاں یہی فکری اختلاف علی گڑھ اور بنارس کی علامتوں سے ہوتا ہوا پاکستان اور بھارت کی صورت میں سامنے آیا۔اس طرح ایک مختصر تاریخی واقعہ پورے برصغیر کی سیاسی تاریخ کا استعارہ بن جاتا ہے۔مختار مسعود نے علی گڑھ کے طلبہ کے کردار کو بھی فلیش بیک کے ذریعے زندہ کیا ہے۔قائداعظم کی بگھی کھینچنے والے نوجوان، مولانا آزاد کی ٹرین روکنے والے طلبہ اور تحریکِ پاکستان میں ان کا جوش و جذبہ صرف تاریخی معلومات نہیں بلکہ اس نسل کے قومی شعور کی عکاسی کرتے ہیں۔مصنف ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے ماضی اور حال کا تقابل بھی کرتے ہیں اور اس افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ وہی جذبۂ عمل بعد کے زمانوں میں کمزور پڑ گیا۔اس تقابلی انداز نے فلیش بیک کو محض یادداشت نہیں بلکہ ایک تنقیدی اور اصلاحی وسیلہ بنا دیا ہے۔

مختار مسعود کی تحریروں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی عام مشاہدے سے بھی ایک وسیع تاریخی منظر نامہ ترتیب دے دیتے ہیں۔جب وہ لندن کے ٹاور میں محفوظ **کوہِ نور** دیکھنے جاتے ہیں تو ان کے ذہن میں نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، رنجیت سنگھ اور برطانوی سامراج کی پوری تاریخ تازہ ہو جاتی ہے۔مصنف کے لیے کوہِ نور صرف ایک قیمتی پتھر نہیں بلکہ اقتدار، لالچ، خونریزی اور انسانی حرص کی علامت ہے۔مصنف جب کوہ نور ہیرا دیکھنے

ماخذ تحقیقی مجلہ
ISSN (P): 2709-9636 | ISSN (O): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

جا رہے تھے تو ان کے ذہن میں اس سے متعلقہ ماضی کے واقعے گردش کر رہے تھے۔ جنھیں مصنف نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ مصنف کو کوہ نور ہیرا دیکھنے کے بعد مایوسی ہوئی تو انھوں نے دل ہی دل میں نادر شاہ کو ماضی میں ہیرے کے لیے کی گئی جد وجہد اور قتل عام پر کوسا۔ یہ سارا احوال مصنف اپنی تحریر میں شامل کرتے ہیں۔ وہ اس کے بارے میں اپنی کتاب **آواز دوست** میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔:

> "مجھے محمد تغلق کا مینار دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ ٹاور آف لندن ضرور دیکھا ہے۔ جہاں کوہ نور ہیرا رکھا گیا ہے۔ اس لیے میرا شوق مجھے وہاں لے گیا۔۔۔ مگر ہیرا دیکھتے ہی میرا شوق مایوسی میں بدل گیا۔ حیرت ہوئی کہ نادر شاہ نے کیوں اس پتھر کے لیے اتنا قتل عام کیا۔ مجھے تو اس ہیرے میں کوئی کشش نظر نہ آئی۔ مگر جب رنجیت سنگھ کی نظریں اس پر پڑی تو بقول مورخ "سرکار دولتمند اراز مشاہدہ بسیار از منفرخ و منشرح شدہ۔۔"میں جواہر کی اس دنیا سے اداس لوٹا۔"(۷)

دلچسپ امر یہ ہے کہ ہیرا دیکھنے کے بعد مصنف کو مایوسی ہوتی ہے۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ جس پتھر کے لیے ہزاروں جانیں قربان ہوئیں، وہ حقیقت میں اتنا غیر معمولی بھی نہیں۔ یہاں **فلیش بیک** ایک فلسفیانہ سوال پیدا کرتا ہے کہ انسان اکثر مادی اشیا کے لیے تاریخ میں بے شمار خون بہاتا رہا، مگر ان اشیا کی اصل قدر اس خونریزی کے مقابلے میں بہت معمولی ثابت ہوتی ہے۔ یہی زاویۂ نظر مختار مسعود کو محض مورخ نہیں بلکہ ایک صاحبِ فکر ادیب بناتا ہے۔

۱.۱.۱.

مختار مسعود نے یوگوسلاویہ کے صدر **مارشل ٹیٹو** کے دورۂ لاہور کو بھی فلیش بیک تکنیک کے ذریعے غیر معمولی معنویت عطا کی ہے۔ جب ٹیٹو بادشاہی مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور اس کی عظمت دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں تو مصنف اس منظر کو صرف ایک سفارتی واقعہ نہیں رہنے دیتے بلکہ اسلامی فنِ تعمیر کی عظمت کی علامت بنا دیتے ہیں۔ اسی واقعے کے تسلسل میں مصنف کو یوگوسلاویہ کے ایک چھوٹے سے قصبے **پوچی طلے** کی مسجد یاد آتی ہے، جہاں مسجد تو ویران تھی مگر بچوں کے نام اب بھی "کمال"، "قدیر" اور "مائدہ" تھے۔ یہ منظر اس حقیقت کی علامت بن جاتا ہے کہ تہذیب صرف عمارتوں سے زندہ نہیں رہتی بلکہ نسلوں کی یادداشت، زبان اور

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 5, Issue 2, (April to June 2024)
https://doi.org/10.47205/makhz.2024(5-II)urdu-44

ثقافت میں بھی محفوظ رہتی ہے۔ یہی فلیش بیک حال اور ماضی کے درمیان ایک گہرا تہذیبی رشتہ قائم کرتا ہے۔ اسی طرح اگر مزید دیکھا جائے تو مختار مسعود نے جاپان کے سفر کے دوران ٹوکیو کے بازار کا ذکر کرتے ہوئے جاپانی قوم کی محنت کو تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ وہ امریکی قوم اور جاپانی معاشرے کا تقابل کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ قوموں کی اصل طاقت ان کی تربیت، تہذیب، تعلیم اور ثقافت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

مختصر اگر دیکھا جائے تو مختار مسعود کی "**آوازِ دوست**" میں فلیش بیک تکنیک محض ایک فنی حربہ نہیں بلکہ ان کے پورے اسلوب کی بنیاد ہے۔ وہ حال کے کسی منظر سے ماضی کی طرف سفر کرتے ہیں اور پھر ماضی کی روشنی میں حال کی تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں تاریخ جامد معلومات نہیں بلکہ زندہ تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔ جیسا کہ ان کے مضامین "مینارِ پاکستان، **علی گڑھ کا سنگِ بنیاد، مارشل ٹیٹو، کوہِ نور، ٹوکیو کا باز** اور دیگر مضامین اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ مختار مسعود نے فلیش بیک کو نہایت فنی مہارت، فکری بصیرت اور ادبی وقار کے ساتھ برتا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے انہوں نے قومی تاریخ، اسلامی تہذیب، برصغیر کے سیاسی شعور اور انسانی اقدار کو ایک مضبوط فکری نظام میں پیش کیا ہے۔ یہی وصف ان کی نثر کو اردو ادب میں منفرد اور لازوال بناتا ہے۔ ان کی تحریریں قاری کو صرف ماضی کی سیر نہیں کراتیں بلکہ اسے حال کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے اردو نثر میں فلیش بیک تکنیک کے کامیاب ترین نمونوں مختار مسعود کی تحریر **آوازِ دوست** کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر تنقیدی اصطلاحات، توضیحی لغت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۵۹
۲۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، ابراہیم دیس ایک مطالعہ، جمہور پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۴۳۷
۳۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۲
۴۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۲۱
۵۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۳۲
۶۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۴۲
۷۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۷۱